محمد مظہر الدین صدیقی

خلافتِ راشدہ پر ایک اجمالی نظر

ایک مدت سے مسلمانوں کے اہلِ دماغ اس ذہنی تشویش میں مبتلا ہیں کہ خلافتِ راشدہ کی ناکامی کے متعلق مخالفین اسلام کے پروپیگنڈے کا کیا جواب دیں کیونکہ خلافت کی ناکامی ایک حیثیت سے اسلام کی ناکامی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا نظامِ خلافت صرف ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور تک قائم رہا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ ہی سے اس کے شکست و زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے حضرت علیؓ کے عہدِ حکومت میں جو باہمی خانہ جنگیاں واقع ہوئیں انکے باعث یہ نظام بالکل پارہ پارہ ہو گیا اور بالآخر حضرت معاویہؓ نے خالص ملوکیت کی بنیاد پر قصرِ حکومت کی تعمیر و تنظیم کی۔ سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اصلاحات کا اثر اتنی جلد کیوں زائل ہو گیا۔ کیا واقعتاً اسلام ایک ایسی ناکام انقلابی تحریک تھی جس نے کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔ اس قسم کے سوالات اکثر مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کمیونسٹ اور الحاد پسند افراد اور محدود مسلمانوں کے ضعیف الفکر طبقات خلافت راشدہ کی ناکامیوں کی داستان بہت کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اپنے مشن میں بڑی حد تک ناکام رہا۔ اس قسم کے خیالات کی تردید میں خلافت کے روحانی کارناموں کا جو مرقع آراستہ کیا جاتا ہے، وہ بھی رنگ آمیزی سے بالکل خالی نہیں۔ چونکہ اس میں عہدِ خلافت کے کمزور پہلوؤں سے بالکل تعرض نہیں کیا جاتا اس لئے خلافت کی یہ افسانوی منظر آرائی اکثر و بیشتر مخالفین اور معترضین کو مطمئن کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس مضمون میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجائیں اور واقعیت کا دامن ہاتھ سے چھوڑے ہوئے ہم اس سوال پر روشنی ڈالیں کہ کیا خلافتِ راشدہ واقعتاً ناکام رہی اگر وہ ناکام ثابت ہوئی تو اس کی ناکامی مکمل تھی یا جزئی اور اگر وہ کامیاب تھی تو اس کی کامیابی کا دائرہ کہاں تک وسیع تھا۔

اس بحث کے ضمن میں معترضینِ اسلام کے اندازِ گفتگو سے اکثر یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا اُن کے خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کا زمانہ انیسویں یا بیسویں صدی کا ترقی یافتہ زمانہ تھا اور اسلامی انقلاب کے داعیوں کو نظم و نسق کی وہ تمام سہولتیں و وسائل تنظیم کی وہ ساری فراوانیاں، تبلیغ و اشاعت اور حمل و نقل کی وہ جملہ آسانیاں میسر تھیں جن سے گذشتہ دو صدیوں کی انقلاب پسند جماعتیں استفادہ کرتی رہیں۔ یہ لوگ اس بدیہی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلامی انقلاب ایک ایسے ملک میں آیا جو زمانہ حال کی ترقیات تو کیا ہم عصر متمدن ممالک کی مادی سہولتوں سے بھی ناآشنا تھا جہاں علم و فضل کی کوئی

روایات - عقلی ترقیات کے کوئی آثار - قومی شعور اور منظم حکومت کے کوئی علامات بھی موجود نہ تھے - اس طرح اسلام کو تمدن زندگی کا وہ ابتدائی ڈھانچہ بھی نہ مل سکا جو کسی علمی، مذہبی اور اخلاقی تحریک کے فروغ کی ابتدائی شرط ہے۔ اسلامی تحریک ایک ایسے ملک میں ظہور پذیر ہوئی جہاں اُسے ہر شعبۂ حیات کی ابتدائی تعمیر کا مسالہ خود فراہم کرنا پڑا - اس لحاظ سے اسلام کی بہ نسبت موسویت اور عیسویت دونوں کو مقابلتہً زیادہ سازگار ماحول میسّر آیا - حضرت موسیٰؑ نے اپنی تحریک مصر سے شروع کی جو معصر دنیا کی تہذیب کا مرکز اور ایک عظیم سلطنت کا مولد و منشا تھا - اسی طرح عیسائیت فلسطین میں نمودار ہوئی جو رومی سلطنت کا صوبہ ہونے کی وجہ سے ایک باقاعدہ نظم ونسق سے آشنا تھا یہاں رومیوں کا ایک گورنر اپنے عملہ کے ساتھ رہا کرتا تھا اور روما کی مرکزی حکومت کے ہدایات کے تحت کام کرتا تھا - رومیوں کے قبضہ سے پہلے بھی فلسطین میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے فرمانروا گزر چکے تھے - اس لئے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے پیرو وقت کی تہذیب و تمدن، علوم وفنون اور نظم و نسق حکومت سے بالکل ناآشنا نہ تھے - لیکن عرب اور بالخصوص شمالی عرب کی حالت جہاں اسلام نمودار ہوا اسکے بالکل برعکس تھی اس ملک کے شمالی حصے میں کبھی کوئی منظم حکومت قائم نہیں ہوئی - تاریخ عالم کے سیاسی انقلابات اور فاتح شہنشاہوں کی ترکتازیوں سے یہ علاقہ ہمیشہ محفوظ و مامون رہا - اسٹرابو نے اپنے جغرافیہ میں لکھا ہے کہ عرب وہ واحد ملک تھا جس نے سکندر کے دربار میں کبھی کوئی سفارت نہیں بھیجی حالانکہ سکندر کی آرزو تھی کہ وہ عرب کو اپنی عالمگیر سلطنت کا مرکز و مستقر بنائے[1] - رومی اگرچہ سارے عالم کے کشورکشا تھے لیکن عربوں پر ان کا بھی بس نہ چل سکا - انھوں نے عرب کو باجگزار بنانے کی صرف ایک مرتبہ کوشش کی جبکہ ۲۴ قم میں مصر سے ایلیس گیلیس (AELIUS GALLUS) کی سرکردگی میں ایک رومی فوجی مہم عربوں کے خلاف روانہ کی گئی - یہ قیصر اغسطس کا زمانہ تھا جبکہ رومیوں کی طاقت اوجِ کمال پر تھی اور شمال کے نبطی عرب ان کے رہنما اور مددگار تھے لیکن اس مہم کو شدید ترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور دس ہزار رومیوں میں سے صرف چند نفوس جان بچا کر مصر واپس پہنچ سکے - اس طرح شمالی عرب میں سیاسی نظم اور حکومت و سلطنت کی روایات ہمیشہ سے ناپید تھیں کیونکہ نہ تو کسی بیرونی طاقت نے یہاں کبھی کوئی حکومت قائم کی اور نہ خود عربوں کی کوئی مرکزی طاقت اُبھر سکی - شمالی عرب کی زندگی قبیلوی نظم اور بین القبائلی تعلقات کی بنیادوں پر قائم تھی -

عربوں کی قبیلوی زندگی کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ نظم و اطاعت کے جذبے اور احترام قانون کے احساس سے تقریباً خالی تھے - حالانکہ یہی وہ خصوصیات ہیں جن پر کسی مضبوط سیاسی نظام کی تعمیر عمل میں آسکتی ہے - دُنیا میں جہاں کہیں اور جب کبھی کوئی متمدن اور ترقی پذیر مملکت قائم ہوئی - اس کی بنیادیں یہ دو اساسی صفات کارفرما تھیں اور انکے بغیر کسی سیاسی معاشرہ کا ارتقاء ناممکن ہے - اس میں شک نہیں کہ عربوں کے ہر قبیلہ کا ایک سردار یا شیخ ہوتا تھا جو اپنے تجربہ - قابلیت اور شرافت خاندانی کی بنا پر اس چھوٹی سی سلطنت میں حاکمانہ اقتدار کے استعمال کا مجاز سمجھا جاتا تھا - لیکن جیسا کہ نکلسن نے

---

[1] فلپ ہٹی؛ تاریخ عرب صفحہ ۴۶

لکھا ہے بجز غیر معمولی حالات کے بالعموم اس کی فرمانروائی کا دائرہ بڑا محدود تھا۔ افرادِ قبیلہ اس کے احکام کی تعمیل پر مجبور نہ تھے۔ ہر فرد اپنا حکمران آپ ہوتا تھا اور کسی دوسرے کی اطاعت کو اپنے لئے باعثِ توہین خیال کرتا تھا۔ عربوں کے ذہن میں سیاسی وفاداری کا یہ تصوّر نہ تھا کہ ایک فردِ معاشرہ اپنے اعلیٰ تر حکام کی اطاعت کرے بلکہ مساوی حیثیت کے افراد کے رضامندانہ تعاون کو وفادارانہ خدمات کا ہم مثل قرار دیا جاتا تھا[1]۔ ایک منظّم مملکت میں مجرم اپنی انفرادی حیثیت میں حکومت کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے لیکن عربوں کی قبیلوی زندگی میں جرم کی نوعیت انفرادی نہ تھی بلکہ پورے قبیلہ کو جرم کا تاوان ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ قبیلوی نظام اس قدر راسخ اور مضبوط تھا کہ اسلام کے بعد بھی عرصہ تک حکومت کو قبیلوی نظم کا تعاون درکار رہا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد تک یہ طریقہ رائج رہا کہ مقتول کا خوں بہا قاتل کو نہیں بلکہ اسکے خاندان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جب بیت المال سے مسلمانوں کے وظائف مقرر کئے تو انھوں نے پہلی مرتبہ اس قاعدہ کو منسوخ کیا ۔۔۔ اور قاتل سے خون بہا وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم عربوں کے قبیلوی نظام کو صرف اس حد تک چھیڑ سکے کہ جرائم کے انتقام کا حق آپ نے افراد اور قبیلوں سے سلب کرکے حکومت کے تفویض کر دیا۔ اسی طرح قبیلوی نظام کے تحت اہلِ عرب محصول کی ادائیگی کو غلامی اور محکومی کی علامت قرار دیتے تھے۔ نتیجۃً ایسی سوسائٹی میں باقاعدہ محصولی نظام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جو ہر منظّم سیاسی معاشرہ کے بقا کی ایک ضروری شرط ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد عرب قبائل نے مدینہ کی مرکزی حکومت کے خلاف جب علم بغاوت بلند کیا اور اکثر قبیلوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تو اس تحریک بغاوت میں یہی جذبہ کارفرما تھا یعنی مدینہ کی حکومت کو محصول ادا کرنا عربی قبیلے اپنے لئے ننگ و عار سمجھتے تھے۔ انھیں وجوہات سے آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ تک اسلامی حکومت کا کوئی باقاعدہ بیت المال قائم نہ ہو سکا۔ آنحضرت کے زمانے میں سب سے اخیر رقم جو وصول ہوئی وہ بحرین کا خراج تھا جس کی تعداد آٹھ لاکھ درہم تھی۔ لیکن آنحضرتؐ نے یہ کل رقم ایک ہی جلسہ میں تقسیم کر دی۔ حضرت ابوبکرؓ کو بھی حکومت کی آمدنی جمع کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ آپ کی وفات کے وقت بیت المال میں صرف ایک درہم نکلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بحرین کا خراج آیا تو کسی شخص کو یقین نہیں آتا تھا کہ پانچ لاکھ درہم جیسی کثیر رقم کا بھی وجود ہوا کرتا ہے۔ عربوں کے ذہن میں سرکاری خزانہ کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد ولید بن ہشام نے بتایا کہ سلاطین شام کے یہاں خزانہ کا ایک جداگانہ محکمہ قائم ہے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے پہلی بار بیت المال کا صیغہ قائم کیا۔ یہی صورت مال وجائداد کے متعلق بھی پیش آتی تھی۔ قبائلی جنگوں میں فاتح قبیلہ مفتوح کا کل مال وجائداد مالِ غنیمت کے طور پر غصب کر لیتا تھا۔ حتیٰ کہ مفتوح قبیلہ کے مرد، عورتیں اور بچے بھی فاتحین کے غلام بن جاتے تھے۔ اس رواج کے باعث آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کو اسلامی فتوحات کے موقعہ پر بڑی سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہر جنگ ختم پر اہلِ فوج کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مفتوحہ علاقہ کی تمام اراضی اور آبادی پر انھیں حق کلی دیدیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی منظّم

لہ

مملکت اور متمدن معاشرہ اس امر کو گوارا نہیں کر سکتا ہے جب تک اسلامی فتوحات اندرون عرب تک محدود رہیں آنحضرتؐ نے اس طریقہ کو بالکل مسدود نہیں فرمایا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب کہ اسلامی افواج متمدن ممالک پر چھانے لگیں آپ نے اس قبیلوی رواج کو جبراً مسدود کر دیا۔ اس سے جو پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ان کا ذکر ہم بعد میں کرینگے۔ اس موقعہ پر ان امور کا ذکر کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عرب کی سرزمین کسی سیاسی اور سماجی اصلاح کے لئے کتنی ناموزوں تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تحریک اسلام کا آغاز کیا تو آپ کا مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کوئی حکومت قائم کریں یا کسی منظم سیاسی معاشرہ کی بنیاد رکھیں۔ آپ صرف انسانوں کے تزکیہ اخلاق اور اصلاح نفوس کا مشن لیکر اُٹھے تھے لیکن ہجرت سے پہلے اور بعد میں جو واقعات پیش آئے اُن سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفوس کا کام ایسا نہیں جو ایک پائدار سیاسی نظم منصفانہ معیشت اور صحتمند معاشرہ کے بغیر پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔ کیونکہ انسانوں کی اخلاقی تعلیم اور روحانی تربیت پر سیاسی اداروں اور سماجی تنظیم کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ جونہیں آپ نے اسلامی تبلیغ و تعلیم کا آغاز کیا عربوں کے قبائلی مفادات اور معاشی گروہ بندیاں آپ کی راہ میں حائل ہونے لگیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ہر طرف لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی جہاں لوگوں کی اطاعت و فاداری کا کوئی مرکز نہ تھا جہاں اسلاف پرستی اور قبیلہ واری تعصب نے انسان کو عقل و استدلال کے ذریعہ طلب صداقت اور تلاش حقیقت سے بیگانہ کر رکھا تھا کسی مذہبی اور روحانی تعلیم کا اس وقت تک فروغ پانا ناممکن تھا جب تک کہ ملک میں امن و امان نہ قائم ہو جائے لوگوں کی جان و مال اور آبرو محفوظ نہ ہو۔ رسم و رواج کی بندشیں ڈھیلی نہ ہوں اور مشاہدات و تجربات کی بنا پر غور و فکر اور استنباط نتائج کی صلاحیت کو ابھرنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ ان حالات کی وجہ سے اسلامی تحریک کو ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کرنی پڑی اور جو کام متعدد لیڈروں اور مصلحوں کے کرنے کا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تن تنہا انجام دینا پڑا۔ پہلے تو آپ کو مدینہ میں ایک پر امن مرکز بنانا تھا جہاں سے اشاعت اسلام کے کام کو پھیلایا جا سکے۔ اس راہ میں یہودی قبائل اور قریش مکہ دونوں حائل تھے۔ مدینہ میں ایک پُر امن مرکز بنانے کے بعد دُوسرا کام یہ تھا کہ عربی قبائل کو ایک سیاسی مرکز کا حلقہ بگوش بنایا جائے ان میں قانون کی اطاعت اور سیاسی وفاداری کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ جنوبی اور شمالی عرب کے قبائل اسلام کی مرکزی حکومت کے مطیع بن کر رہیں۔ اپنے قبیلوی رسوم اور روایات کے مقابلہ میں اسلامی قوانین کی بالادستی تسلیم کریں۔ لوٹ مار اور قتل و غارت سے باز آئیں اور متمدن ملکوں کی رعایا کی طرح مرکزی حکومت کو باقاعدہ محصول ادا کرنا سیکھیں۔ سیاسی اور معاشی اصلاح کا یہ تمام کام بجائے خود اتنا اہم تھا کہ اس کے لئے ایک عمر درکار تھی۔ لیکن جب اس کے ساتھ مذہبی تعلیم و تلقین، فکری تربیت اور اخلاقی تعلیم کا کام بھی شامل کر لیا جائے اور اس امر کو مدّ نظر رکھا جائے کہ یہ سب کچھ آپ کو تیرہ ۱۳ سال کے مختصر عرصہ میں کرنا پڑا تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک مکمل سیاسی نظام اور پائدار معاشی نظم قائم کرنے کے لئے جو حالات و شرائط درکار تھے وہ حضورؐ اور آپ کے خلفاء کو میسر نہیں آئے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اتنے مختصر

عرصہ اور ایسے غیر متمدن مُلک میں جہاں حکومت کا ابتدائی نظم ونسق بھی ناپید تھا، وسیع پیمانہ پر اہلِ مُلک کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ایک امر محال تھا۔ حالانکہ جمہوری ارتقار کے لئے عوام کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور ان میں سیاسی مذہبی اور عمرانی مسائل کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی جمہوری نظام قرار واقعی طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس ترقی یافتہ دَور میں بھی ان ممالک میں جمہوریت ناکام ہے جہاں کے عوام معاشی اور ذہنی حیثیت سے پست ہیں۔ اگر بیسویں صدی عیسوی میں جبکہ تعلیم وتربیت، نشر واشاعت اور نظم ونسق کے وسائل اتنے فراواں ہیں دُنیا کے بیشتر مُلکوں میں جمہوریت کمزور اور ناکام ثابت ہو رہی ہے تو ساتویں صدی عیسوی میں عرب جیسے مُلک میں جمہوری ارتقار کا کیا امکان ہو سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفار کو تمام سیاسی اختیارات اپنی ذات میں مرتکز رکھنے پڑے۔ اس کے باوجود چونکہ اسلام کا مقصد جمہوریت کو ترقی دینا تھا اس لئے جہاں تک ممکن ہوا رائے عامہ کی مرضی اور مشورہ کو مقدم رکھا گیا شورائی انتظام کو ترقی دی گئی اور عمال کے عزل ونصب کو بھی ایک حد تک عوام کی رائے کا تابع کر دیا گیا۔ اسلام کا سب سے بڑا جمہوری اقدام یہ تھا کہ اس نے قانون کی نظروں میں تمام انسانوں کو یکساں قرار دیا اور خود خلیفہ وقت کو بھی عدالتی دارگیر سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں آزادی رائے اور اظہارِ حق پر اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ ان دو خصوصیات کے اعتبار سے اسلامی نظام جدید ترین جمہوری حکومتوں کا ہمسر تھا، اگرچہ سیاسی سطح پر اس نے جمہوریت کا کوئی معین ڈھانچہ نہیں بنایا اور نہ ایسا کرنا اس وقت کے حالات میں ممکن تھا۔ عربوں کی عام جہالت، ذہنی پستی اور سیاسی عدم پختگی کے علاوہ قریش کی مسلمہ قیادت اور بالادستی اسلامی جمہوریت کے ارتقار میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، عرب کے تمام قبائل اس بارے میں یکزبان تھے کہ ان کی رہنمائی اور قیادت کا حق صرف قریش کو حاصل ہے۔ اگر اسلام جمہوری اساس پر کوئی ایسا اساسی نظام وضع کرتا جس میں عرب کے دُوسرے قبائل کو نمائندگی کے اعتبار سے اکثریت حاصل ہو جاتی تو یہ نظام ایک دن بھی نہ چل سکتا بلکہ اسلام کی ناکامی کا موجب بن جاتا۔ قریش کو دُوسرے قبائل پر جو فوقیت حاصل تھی اور جس کو سارے عرب تسلیم کرتے تھے، وُہ ایک حد تک بجا تھی۔ عقل اور تجربہ۔ بین الاقوامی تعلّقات۔ سیاسی سوجھ بُوجھ اور تجارتی واقفیت کے لحاظ سے ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا احساس تھا کہ ایک عرصہ تک عرب قوم قریشِ مکہ کی عقلی اور سیاسی بالادستی سے آزاد نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ الائمۃ من القریش کی حدیث اسی امر واقعہ کا اظہار ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار نے جب یہ تجویز پیش کی کہ ایک امیر انصار کا ہو اور ایک مہاجرین کا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یہی جواب دیا کہ عرب قریش کے سوا اور کسی کی سیادت کو تسلیم نہیں کرینگے اور اس تجویز پر عمل کرنے سے اسلام کا سیاسی شیرازہ بکھر جائیگا۔ قریش کی سیاسی بالادستی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انصار عملاً حقِ خلافت سے محروم ہو گئے اور قریش کے دو بڑے خاندانوں بنو امیہ اور بنو ہاشم کی سیاسی رقابت شدید تر ہو گئی۔ اگر خلافت عملاً قریش تک محدود نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ کے بعد انصار میں سے کسی کو خلافت کا موقعہ مل جاتا اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کے زمانہ کے ناگوار واقعات پیش نہ آتے۔ بنو اُمیّہ اور بنو ہاشم

کی بہ نسبت پہلے دو خلفا یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ غیر جانبدار حیثیت رکھتے تھے کیونکہ وہ نہ بنو امیہ میں سے تھے اور نہ بنو ہاشم میں سے۔ بدقسمتی سے شیخین کے بعد بنو امیہ اور بنو ہاشم سے باہر کوئی اور قریشی امیدوار خلافت بنکر سامنے نہ آیا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سعد بن وقاص دونوں بارِ خلافت اُٹھانے پر تیار نہ تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ہوتے ہوئے کسی اور امیدوار کو ترجیح دینا بھی مشکل تھا۔ اِس لئے انتخابِ خلافت انھیں دونوں تک محدود رہا اور اس کی وجہ سے بنو ہاشم اور بنو امیہ کی خاندانی رقابت کو اُبھرنے کا موقعہ ملا۔

بنو امیہ اور خاندان بنو ہاشم کی سیاسی رقابت کے نتائج اتنے خطرناک نہ ہوتے اور نظامِ خلافت پھر بھی قائم رہتا اگر جمہورِ عرب سیاسی اطاعت گزینی اور معاشرتی نظم وضبط کی قدر وقیمت سے واقف ہوتے۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں عربوں کی انفرادیت اور قبیلہ پرستی سیاسی مرکزیت کی راہ میں ہمیشہ سے سدِّ راہ تھی۔ اِسلام نے بڑی سخت جدوجہد کے بعد اس انفرادیت پر تھوڑا بہت قابو حاصل کیا لیکن قدیم روایات وخصوصیات بڑی مشکل سے فنا ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب کبھی مرکزی اقتدار کی گرفت کمزور ہوتی تو جمہورِ عرب کے مرکز گریز رجحانات ان پر دوبارہ غالب آجاتے۔ اس کا تجربہ ایک مرتبہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوا جبکہ عرب میں چاروں طرف بغاوت کی آگ پھیل گئی، اور عرب قبائل مدینہ کی حکومت سے انحراف کرنے لگے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مضبوط پالیسی نے ان خطرناک میلانات کو پوری طرح قابو میں رکھا۔ دوسری بار اس کا تجربہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے موقعہ پر ہوا جبکہ کوفہ اور مصر کے فتنہ پردازوں نے مدینہ میں لاقانونی کا دروازہ کھولدیا حضرت عثمانؓ نے سختی سے کام لینے کے بجائے اس سرکشی کو برداشت کرلیا جس سے ان لوگوں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اسی لامرکزیت اور سیاسی عدم اطاعت کا تجربہ تیسری بار خوارج کی بغاوت میں ہوا جنھوں نے اپنے لیڈر حضرت علی کا حکم ماننے سے صاف انکار کردیا۔ غرضیکہ عربوں کی انفرادیت اور سیاسی اطاعت کا فقدان ہمیشہ خلافت کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ اسلام ان لوگوں کی جمہوری رُوح کو فنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن انھیں آئین شناسی اور نظم وضبط کا عادی بنانے کا کوشاں تھا۔ لیکن اِسلام کو عوامی تعلیم وتربیت کا بہت کم موقعہ مل سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کو ہمہ وقت جنگوں میں مصروف رہنا پڑا اور اس مختصر عرصہ میں اتنے قلیل وسائل وذرائع کے ساتھ عوامی تربیت کا انتظام کرنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی، کہ اسلامی تحریک چلانے والوں نے خواص کی تربیت پر زیادہ زور دیا تاکہ عوام اگر تربیت یافتہ نہ ہوسکیں تو کم ازکم ایک اعلیٰ درجہ کی قیادت وجود میں آجائے۔ جو فکری اور اخلاقی حیثیت سے قوم کی رہنمائی کرسکے۔ اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِسلام اس کوشش میں کامیاب ہوا، اور حضورؐ کے فیضِ تربیت سے مدینہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی منتخب لیڈرشپ کا مرکز بن گیا لیکن کئی وجوہ سے جن کا ذکر ہم بعد میں کرینگے مدینہ کی یہ مرکزیت قائم نہ رہ سکی، اور حضرت عمرؓ کی یہ کوشش ناکام ہوگئی کہ اسلام کی مرکزی قیادت مدینہ سے باہر منتقل نہ ہو۔

خلافت راشدہ کے زوال کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسلامی مملکت کے حدود نہایت قلیل عرصہ میں دُور دراز تک پھیل گئے۔ اس ترقی یافتہ زمانہ میں بھی کسی جمہوری نظام کے تحت اتنی بڑی مملکت پر قابو حاصل کرنا دشوار ہوتا چہ جائیکہ ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ حمل و نقل کے ذرائع تقریباً مفقود اور صوبوں کے نمائندہ اشخاص کا باہمی ربط و ضبط اور مشاورت غیر ممکن تھی۔ یہ صرف حضرت عمرؓ جیسے غیر معمولی انسان کا کام تھا کہ اُنھوں نے جمہوری روایات کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے اتنی بڑی سلطنت کو قابو میں رکھا اور اپنے اقتدار کی گرفت کمزور نہیں ہونے دی۔ لیکن عمر جیسے انسان تاریخ میں بار بار نہیں پیدا ہوتے ہیں سلطنت کی توسیع کے ساتھ اس کا مرکز ثقل بدل گیا تھا اور اب یہ ناممکن تھا کہ عرب جیسے دُور دراز ملک سے اس کے معاملات کی سربراہی کی جا سکے۔ حضرت علی کو اپنے زمانہ خلافت میں مدینہ چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے کوفہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا کیونکہ عراق اور ایران کے معاملات کی نگرانی کوفہ سے ہی ہو سکتی تھی۔ حضرت علی کے مقابلہ میں حضرت معاویہ کو جو کامیابی ہوئی اس کا سبب بھی یہی تھا کہ وُہ سلطنت اسلامی کے مرکز ثقل سے قریب تھے اور شام کے جمہور اور لیڈروں سے قریبی ربط پیدا کر سکتے تھے جو حضرت علی کے لئے اتنی دُور سے ممکن نہ تھا۔ غرضکہ جغرافیائی حقائق اسلامی مملکت کی جمہوری اساس سے ٹکرا رہے تھے۔ اور ایک مضبوط آمریت کے قیام کے مقتضی تھے۔ تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں تھا کہ توسیع سلطنت جمہوری نظام کے حق میں مہلک اور آمریت کے لئے سازگار ثابت ہوئی ہو۔ اس سے پہلے جمہوریہ روما پر بھی یہی حادثہ گزر چکا تھا اس لئے ہم مختصر طور پر پہلے جمہوریہ روما کے زوال کا جائزہ لیتے ہیں۔

ابتداءً رومیوں کی حکومت ایک شہری مملکت تھی، جو شہر روما اور آس پاس کے علاقوں تک محدود تھی۔ اس شہری مملکت کا دستور جمہوری تھا یعنی ایک منتخبہ سنات (SENATE) سارے اختیارات کی مالک ہوتی تھی۔ اس کی رائے کے بغیر نہ تو کوئی قانون بنایا جا سکتا تھا۔ اور نہ کسی اہم انتظامی معاملہ کا تصفیہ عمل میں آسکتا تھا۔ ہر سال سنات کے اراکین میں سے دو عہدہ دار منتخب کئے جاتے تھے جو قونصل کہلاتے تھے۔ ان کے عہدہ کی مدّت صرف ایک سال ہوتی تھی۔ یہ دونوں قونصل انتظامی اور فوجی نظم و نسق کے ذمہ دار تھے اور بسا اوقات جنگی مہمات کی سربراہی بھی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ہر سال بیس اعلیٰ مجسٹریٹوں کا انتخاب بھی عمل میں آتا تھا۔ ان کے عہدہ کی مدت بھی ایک سال ہوتی تھی، اکثر انتظامی اور عدالتی فرائض انھیں کے سپرد تھے جمہوریہ روما کی فوج رومی شہریوں پر مشتمل تھی جن میں سے بیشتر کھیتی باڑی کا پیشہ کرتے تھے۔ جو نہیں رومن فتوحات کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہوا اور صقلیہ۔ سارڈینیا، افریقہ۔ یونان اور مصر کے علاقے روما کے قبضہ میں آگئے۔ اس آئینی ڈھانچہ میں تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ فتوحات کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ اراکین سنات اور عام رومی شہریوں کے معیار زندگی میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ رومی سنات کے اراکین یونانی غلاموں کے ایک کثیر انبوہ کی خدمات سے مستفید ہونے کے باعث امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے لگے۔ دُوسری طرف جنگی مصروفیات کے باعث رومی کاشتکاروں کے زراعتی کاروبار

کو سخت نقصان پہنچا اور انھوں نے مجبوراً اپنی اراضی بڑے بڑے زمینداروں کے ہاتھ فروخت کردیں جسکی وجہ سے زرعی جاگیرداروں کا ایک نیا طبقہ وجود پذیر ہونے لگا۔ بالعموم سنات کے ارکان ہی فروخت شدہ اراضی کے مالک بن گئے تھے کیونکہ فتوحات کے باعث سب سے زیادہ دولت انھیں کے ہاتھ میں آئی اس طرح زراعت پیشہ آبادی اور اُمرار کے درمیان ایک طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوا جو جمہوری نظام کے زوال کی جانب پہلا قدم تھا۔ اسی کے ساتھ صوبوں کے نظم ونسق کو بھی انتخابی طریق کار سے نقصان پہنچنے لگا۔ کیونکہ اکثر صورتوں میں صوبہ کا گورنر کوئی منتخبہ مجسٹریٹ ہوا کرتا تھا جس کی مدتِ کار صرف ایک سال ہوتی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی گورنر ایک سال کے اندر مقامی حالات سے پورے طور پر واقف نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے مجسٹریٹوں کو گورنر بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال صوبوں کو ایک ناپختہ کار اور ناواقف گورنر سے واسطہ پڑتا جب وہ ایک سال کی مدت میں مقامی حالات اور نظم ونسق سے واقف ہونے لگتا تو اس کی مدت ختم ہوجاتی اور دوسرا گورنر اس کی جگہ آجاتا۔ علاوہ ازیں رومی صوبہ جاتی گورنروں کو رشوت ستانی کے بیش بہا موقع حاصل تھے۔ روما کی مرکزی سنات اتنی دُور سے صوبہ جاتی نظم ونسق کی دیکھ بھال نہیں کرسکتی تھی اور نہ رومی گورنروں کے کام کو تفصیلی طور پر جانچ سکتی تھی محصولوں کی وصولی عدالتوں کی دیکھ بھال اور فوجی رسد کے انتظامات یہ سب کام گورنر کی راست ذمہ داری میں ہوتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے ذریعہ وہ اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے لاانتہا دولت پیدا کرسکتا تھا۔ صوبوں کے باشندوں کو رومی گورنر اور اس کے عملہ سے جو شکایات ہوتیں ان کی جانچ پڑتال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کیونکہ سنات کو صوبہ داری نظم ونسق کی خرابی یا اچھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب تک صوبہ جاتی بدنظمی کا براہ راست اثر خود روما کے شہریوں پر نہ پڑتا روم کا کوئی عہدہ دار رعایا کی دادرسی سے دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ ان وجوہات سے بہت جلد روما میں اندرونی خانہ جنگیوں کی ابتدا ہوئی بالکل اسی طرح جیسے پہلے دو خلفا کے بعد اسلامی حکومت کو اندرونی فتنہ وفساد کا سامنا کرنا پڑا۔

روما کی اندرونی کشمکش کا آغاز اس وقت شروع ہوا جبکہ ٹائبیرس اور گائس گریکس (TIBERIUS AND GAIUS GRACCHUS) دو بھائیوں نے رومی سنات کے ارکان کی بڑھتی ہوئی جاگیروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کسانوں کے حقوق کی حفاظت کا دم بھرنا شروع کیا۔ ۱۳۳ ق م میں جبکہ ٹائبیریس گریکس ٹرائبیون کے عہدہ پر منتخب ہوا اس نے ایک قانون منظور کروانے کی کوشش کی کہ اطالیہ کی وہ بڑی بڑی اراضی جو فتوحات کے دوران میں رومیوں کے ہاتھ آئی تھیں حکومت کی ملک قرار دی جائیں اور انھیں محروم الملک کسانوں کے درمیان تقسیم کردیا جائے۔ مجوزہ قانون سنات کے مفاد کے یکسر منافی تھا، اس لئے اسکی شدید مخالفت کی گئی۔ دس سال کے بعد جب گائیس گریکس ٹرائبیون منتخب ہوا تو اس نے پھر اپنے بھائی کی تجویز کو منظور کرانا چاہا لیکن اس نے ساتھ ہی یہ محسوس کیا کہ یہ مسئلہ سیاسی ہے اور اس وقت تک طے نہیں ہوسکتا جب تک رومی سنات کے غیر معمولی اختیارات قائم ہیں اور اس کے مقابلہ میں جمہور بے دست وپا ہیں اس لئے اس نے اطالیہ کے تمام باشندوں کو حق رائے دہندگی دلانے کا بیڑا اُٹھایا۔ ان تجاویز کے باعث سنات اور جمہور کی کشمکش نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلی جس کا

دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا گیا۔ ٹائبیریس گریکس اور اس کے تین سو وفادار ساتھیوں کو اس اندرونی کشمکش کے باعث اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اسی زمانہ میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ سنات کے فوجی اختیارات اور سابقہ فوجی نظم و نسق کو تبدیل شدہ حالات میں قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ افریقہ کی ایک بغاوت کو فرو کرنے میں سنات کے مقرر کردہ جنرل بالکل ناکام رہے اور لوگوں کے احتجاج سے متاثر ہو کر سنات نے مجبوراً ماریس (MARIUS) کو اس کام کے لئے مقرر کیا جو عوام میں مقبول تھا ماریس جب اس مہم کو سر کرنے کے بعد وطن واپس ہوا تو اس کی ہر دلعزیزی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ لیکن ابھی اس کی واپسی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ شمال کے کلت قبائل (CELTIC TRIBES) نے اطالیہ پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ پھر سنات کے مقرر کردہ جنرلوں کو فوجی ناکامی ہوئی کیونکہ یہ لوگ بالعموم پیشہ ور نہ فوجی نہیں ہوتے تھے، بلکہ روم کے معزز شہریوں میں سے ان کا انتخاب عمل میں آتا تھا اور انکی مدت کار صرف ایک سال ہوتی تھی۔ جمہوریہ روما کے حدود جب تک اطالیہ تک محدود تھے اس وقت تک یہ فوجی نظم و نسق کارآمد تھا۔ لیکن مملکت کے حدود کی توسیع کے بعد جب جنگوں کا طول طویل سلسلہ شروع ہوا تو زیادہ تجربہ کار فوجی جنرلوں کی ضرورت محسوس ہوئی جنھیں اپنے پیشہ میں ماہرانہ واقفیت حاصل ہو۔ علاوہ ازیں ایک سال کی مدت تقرر ناکافی ثابت ہوئی کیونکہ اکثر کئی برسوں تک سلسلہ جنگ جاری رہتا۔ ان امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی جنرلوں کی اہمیت و طاقت بڑھنے لگی اور اسی نسبت سے سنات کی بالادستی اور قوت و اقتدار میں کمی واقع ہونے لگی، چنانچہ کلت قبائل کے حملہ کے بعد ماریس کو ایک بار پھر فوجی قیادت سپرد کی گئی اور جب وہ حملہ آوروں کو شکست فاش دیکر روم واپس ہوا تو رومی عوام میں اس کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ماریس نے سابقہ شہری فوج کے بجائے ایک پیشہ ورانہ فوج بھرتی کرنے کا طریقہ رائج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ سے رومی فوج شہریوں پر مشتمل ہونے کی بجائے پیشہ ور نہ سپاہیوں کی فوج بن گئی۔ اس نئی فوج کے سپاہی سنات کے احکام کے تابع ہونے کے بجائے اپنے پیشہ ور جنرلوں کے تابع ہوتے تھے اور انکی رضاجوئی کو مقدم سمجھتے تھے اس طرح روما کی جمہوریت فوجی آمریت میں تبدیل ہونے لگی۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد اطالیہ کے دوسرے شہریوں نے روم کی مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی کیونکہ اطالوی باشندوں کو رومی جمہوریت میں مساوات کا درجہ حاصل نہ تھا اور انھیں ابھی تک رومی شہریت کے حقوق حاصل نہ تھے۔ ماریس اپنی فوجی قابلیت کے باوجود اس سیاسی مسئلہ کا کوئی حل دریافت نہ کر سکا۔ اس لڑائی کے دوران میں ایک اور فوجی جنرل کو نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔ جس کا نام سلا (SULLA) تھا اور ابھی یہ لڑائی ختم نہ ہونے کو تھی کہ پانٹس کی ریاست کے حکمران میتھریڈیٹس (MITHRIDATES) نے ایشیائے کوچک کے رومی مقبوضات پر حملہ کر دیا۔ یہ ریاست بحر اسود کے قریب واقع تھی اور میتھریڈیٹس نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے اس کی طاقت کو مضبوط کر دیا تھا۔ اب اسے روم سے ٹکر لینے کا خیال پیدا ہوا۔ رومی سنات نے اس حملہ آور کے خلاف کوئی جرأت آموز اقدام نہیں کیا اور اس کے حوصلے اتنے بڑھے کہ وہ یونان

کی سرحد پر آپہنچا۔ اب مجبوراً سنات کو اس امر کا تصفیہ کرنا پڑا کہ اس حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لئے کس جنرل کو مقرر کیا جائے۔ ماریس کو یا سلا کو۔ سلا سنات کو گزور پا کر اپنی فوج کے ساتھ روم میں داخل ہو گیا۔ ماریس اور اس کے رفقاء کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اس طرح سنات نے مجبوراً پانٹس کی فوجی مہم پر سلا کو روانہ کیا۔ چار سال بعد جب وہ اس مہم کو کامیابی کے ساتھ سر کر کے روم واپس ہوا تو یہاں صورتِ حال اس کے مخالف تھی۔ ماریس اور اس کے رفقاء نے موقعہ پا کر روم پر قبضہ کر لیا اور سنات کو اس کے اختیارات سے بالکل محروم کر دیا لیکن اسی عرصہ میں ماریس کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے سلا کو روم پر قبضہ کرنے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ سلا نے ماریس کے برعکس سنات کے اقتدار کو قائم رکھا لیکن اس کے آئین و اختیارات میں بہت سی تبدیلیاں کر دیں۔ سلا کے بعد اس کا قائم کردہ نظام نو سال تک جاری رہا۔ لیکن اس عرصہ کے بعد پھر فوجی جنرلوں کے مابین اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی۔ اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ سلا کی آئینی اصلاحات میں جمہوریہ روما کے دو بڑے مسائل کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ایک تو صوبہ جاتی گورنروں کے غیر معمولی اختیارات کا مسئلہ تھا۔ یہ گورنر روز بروز مطلق العنانی کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے اور سنات کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ روم جیسے دور دراز مقام سے ان کی مؤثر نگرانی کر سکے دوسرا مسئلہ غلاموں کا تھا۔ جن سے بڑی بڑی جاگیروں پر نہایت بے رحمی اور ظالمانہ طریقوں سے کھیتی باڑی کا کام لیا جاتا تھا جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے۔ ٹائبیریس گریکس بڑی بڑی زمینداریوں اور جاگیروں کو جو فتوحات کے بعد قائم ہوئی تھیں منسوخ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اور ان زمینوں پر غلام کاشتکاروں کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی تھی جس کا نتیجہ بالآخر ایک وسیع پیمانہ کی بغاوت میں ظاہر ہوا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے رومی سنات نے کراسس کا تقرر کیا اور اس نے تقریباً چالیس ہزار فوج کی مدد سے بڑی خونریز کشمکش کے بعد غلاموں کو شکست دی۔ دوسری طرف خود سر صوبائی گورنروں کو زیر کرنے کے لئے ایک دوسرے جنرل پامپی کا تقرر عمل میں آیا۔ اب یہ دونوں جنرل اپنی اپنی مہمات کو سر کرنے کے بعد روما میں جمع ہوئے اور قریب تھا کہ ان کے مابین ایک نہایت شدید خانہ جنگی کی ابتدا ہو لیکن چونکہ یہ دونوں رومی سنات کے اقتدار کے مخالف تھے اس لئے ان میں اس امر پر اتحاد ہو گیا کہ سنات کی خود مختاری کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سلا کے آئین مزید ترمیم کر کے سنات کی قوت کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ اس کے بعد پامپی پانچ سال تک بیرونی فوجی مہمات کے سلسلہ میں روم کے باہر رہا اور بالآخر جب وہ روم واپس آیا تو اس کی شہرت و عزت اور فوجی قوت بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پامپی کے غیاب میں روما کی مسند قیادت سزر کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہ شخص جمہوریت پسند تھا اور اس کا خیال تھا کہ سنات کے اقتدار کو بحال کر کے روما کو پھر جمہوری طرز حکومت کے مطابق ایک آئینی سلطنت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اس مقصد کے لئے فوجی طاقت کا تعاون ضروری تھا اس خیال سے اس نے پامپی کو اپنا حلیف بنانے کا ارادہ کیا لیکن ایک اور فوجی جنرل جولیس سیزر نے سزر کے جمہوری ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ بہت بڑا فوجی جنرل ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجہ کا سیاستدان بھی تھا۔ حالات کے مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ سنات جمہوری طریقوں سے اتنی بڑی سلطنت کا

انصرام نہیں کر سکتی۔ صرف فوجی آمریت کا قیام ہی وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے، اس کے دل میں سیزر کی عزت تھی مگر وہ دیانتداری سے یہ یقین رکھتا تھا کہ اس کا جمہوری نصب العین ناقابلِ عمل ہے۔ چنانچہ سیزر کی سیاسی دانشمندی سے یہ تینوں فوجی جنرل یعنی پامپی۔ کراسس اور سیزر اس بات پر متفق ہو گئے کہ سنات کو حکومت سے بے دخل کر دینا ضروری ہے انھوں نے باہمی سمجھوتہ سے سلطنت کے تین مختلف صوبائی علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ سیزر گال یعنی فرانس کے علاقہ کا سربراہ کار ہو گیا اور وہاں نو سال تک فوجی مہمات و فتوحات میں مصروف رہا۔ کراسس کو مشرق روانہ کر دیا گیا جہاں ایرانیوں کے خلاف جنگ جاری تھی۔ پامپی کے حصہ میں اسپین آیا مگر اس نے روما میں رہنا پسند کیا اور اپنے ایک نائب کو اسپین روانہ کر دیا۔ اتفاق یہ کہ کراسس ایرانیوں کے خلاف جنگ میں مارا گیا۔ پامپی نے جو روما میں موجود تھا موقعہ پا کر سنات سے ساز باز کر لی اور سیزر کے خلاف سازش کرنے لگا۔ جب سیزر کو اس سازش کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنی فوج لے کر روم پر دھاوا بول دیا۔ پامپی اس سے مقابلہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ اور یونان بھاگ گیا جہاں سنات کی مدد سے اس نے فوجیں جمع کرنی شروع کیں۔ لیکن سیزر نے اس کا پیچھا کیا اور فارسلس (PHARSLES) کی لڑائی میں اسے شکست فاش دی۔ اس طرح وہ روما کی عظیم الشان سلطنت کا مختارِ کل بن گیا اور سنات کی طاقت ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئی۔ اگر جنگ زاما کو جو ۲۰۲ ق م میں ختم ہوئی اور جس میں روما نے ہنیبال کو شکست دی رومی طاقت کا نقطہ آغاز اور جولیس سیزر کے داخلہ روم کو جو ۴۹ ق م میں واقع ہوا رومی جمہوریت کے خاتمہ کا سال قرار دیا جائے، تو رومی جمہوریت کی عمر صرف ڈیڑھ سو سال رہ جاتی ہے۔

رومی جمہوریت کی ناکامی کے جو اسباب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کسی قدر فرق کے ساتھ وہی اسباب خلافتِ راشدہ کے شورائی نظام کو ملوکیت کی طرف لے جا رہے تھے۔ البتہ اسلام کی مرکزی حکومت کا اقتدار صوبوں اور فوجی جنرلوں پر اس سے کہیں زیادہ قوی تھا جتنا کہ رومی سنات کا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے دو خلفاء کے عہدِ حکومت تک نہ تو فوج میں کوئی سرکشی پیدا ہو سکی، نہ صوبائی گورنروں کو یہ موقع ملا کہ وہ عوام الناس پر ظلم و ستم کر کے اپنی اور اپنے دوستوں کی جیبیں بھریں اور نہ مال و دولت کی تقسیم اس طرح پر عمل میں آئی کہ جس سے صرف حکمران طبقہ کو عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملتا اور دوسرے طبقوں کو معیشت کی خوشحالی کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ اسلام کے پہلے دو حکمرانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تربیت اور سیاسی تعلیم کے زیر اثر ان خرابیوں کا دروازہ پہلے ہی سے بند کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اپنے فوجی جنرلوں پر کتنا قابو حاصل تھا، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے حضرت خالد بن ولید جیسے ممتاز جنرل کو انکے عہدہ سے معزول کر دیا اور ان کے اس فعل سے فوج میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ یہی حال صوبائی گورنروں کا تھا، کہ انھیں ذرا ذرا سی بات کے لئے خلیفۂ اسلام کے سامنے جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ حج کے موقعہ پر عام لوگوں کو عمال کے خلاف شکایات پیش کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں صوبہ جاتی افسروں کی بدعنوانیوں کی تحقیقات کیلئے

حضرت عمرؓ نے کئی بار تحقیقاتی کمیشن مقرر فرمائے۔ بلکہ اس کام کے لئے یہ ایک خاص عہدہ قائم کیا، جس پر محمد بن مسلمہ انصاری[1] مامور تھے۔ فتوحات کی وسعت کے ساتھ مال و دولت کی منصفانہ تقسیم کا بھی خلفائے اسلام نے خاص طور پر خیال رکھا حضرت ابوبکرؓ نے تو وظائف کی تقسیم میں کسی فضیلت یا خدمت یا امتیاز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سب مسلمانوں کے مساوی وظائف مقرر کئے۔ حضرت عمرؓ نے البتہ اسلامی خدمات کے لحاظ سے وظائف کی مقدار معین کی اور اہل بیت کو سب سے زیادہ حق دیا۔ پھر اہل بدر کو اور اسی طرح حسب مدارج عام مسلمانوں کو۔ لیکن آپ نے کسی خاص طبقہ کو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی دولت کا اجارہ دار نہیں بننے دیا۔ بلکہ بیت المال کا دروازہ ایسے غیر مسلم افراد پر بھی کھول دیا جو بڑھاپے، معذوری یا بیکاری کی وجہ سے مستحق امداد تھے۔ اس طرح اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں ان خرابیوں کا مؤثر انسداد کیا جو رومن فتوحات کے زمانہ میں رومیوں کے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے یہ خرابیاں پھر ظاہر ہونے لگیں اگرچہ ان کا دائرہ قدرتاً بہت محدود تھا۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں خلافتِ راشدہ کے دور میں سول طاقت فوجی طاقت پر ہمیشہ غالب رہی اس لئے رومیوں کے برعکس اسلام میں فوجی آمریت کا قیام عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن اس کے باوجود فوج اور سول طاقت کے درمیان ایک طرح کی کشمکش اور مخالفت جاری رہی چنانچہ خلافت راشدہ کے زوال میں منجملہ اور اسباب کے فوج کی بے اطمینانی اور خودسری کا بھی دخل تھا۔ اس کا تعلق عربوں کی قبائلی روایات سے تھا۔ اسلام سے پہلے قبائلی جنگ کا یہ ایک مسلمہ قانون تھا کہ مفتوحہ علاقہ کی کل اراضی اور آبادی کو مال غنیمت تصور کیا جاتا تھا اور فاتح قبیلہ مفتوح کی زمین کو آپس میں تقسیم کر لیتا اور اس کی آبادی کو لونڈی غلام بنا لیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفتہ رفتہ اس وحشیانہ طریقہ میں تبدیلی فرمائی۔ چنانچہ قرآن نے پہلی مرتبہ عربوں کے رسم و رواج کے خلاف فئے یعنی مفتوحہ مال و جائداد کو اللہ اور رسول یعنی اسٹیٹ کی ملکیت قرار دیا۔ اس اصول کے قائم کرنے سے پہلی مرتبہ اہل فوج کے حقوق پر ضرب پڑی یعنی اہل فوج یہ مطالبہ نہیں کر سکتے تھے کہ ہر فتح کے موقعہ پر تمام مال مفتوحہ اُن کے قبضہ میں دے دیا جائے لیکن عملاً اس اصول کو نافذ کرنے کا سہرا حضرت عمرؓ کے سر ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کے زمانہ میں اہل فوج کو کوئی باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی اور نہ حکومت کی آمدنی کا کوئی مقررہ ذریعہ تھا۔ اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑی حد تک سابقہ قبائلی رسم و رواج کے مطابق عمل کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ خیبر کی فتح کے موقعہ پر آپ نے مفتوحہ اراضی کے اٹھارہ حصے اہل فوج کو عطا فرمائے کیونکہ انکی فوجی خدمات کا معاوضہ کسی اور صورت میں دینا ممکن نہ تھا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں جب شام و عراق کی فتوحات عمل میں آئیں تو پھر یہ مسئلہ پیش ہوا۔ اور چونکہ اسلامی اصولوں کے بارے میں ابھی تک ذہن صاف نہ تھے اس لئے اہل فوج نے خیبر کی فتح کے موقعہ پر آنحضرتؐ کے طرز عمل سے استدلال کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ عربوں کی قبائلی رواج کے مطابق عراق اور شام کی اراضی اہل فوج میں تقسیم کر دی جائیں لیکن حضرت عمرؓ نے

---

[1] شبلی نعمانی: الفاروق صفحہ ۲۷۷۔

دیگر صحابہ سے استمزاج اور مشورہ کے بعد فوج کے اس مطالبہ کو رد کر دیا اور قرآن کی حسب ذیل آیت سے استدلال کیا :۔

مَا افاء اللّٰہ علیٰ رسولہٖ من اھل القریٰ فللّٰہ و للرّسول و لذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل .... للفقراء المھاجرین الذین اخرجو من دیارھم ...... والذین جاؤ من بعدھم۔ (سورۂ حشر)

جو زمین یا جائداد (فتوحات کے موقعہ پر) اللہ اپنے رسولؐ کو دلوائے وُہ اللہ کے لئے ہے اس کے رسولؐ کے لئے اور ذوی القربیٰ کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ... نیز ان غریب مہاجروں کے لئے ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ...... اور بعد میں آنے والوں کے لئے ہے ۔

آخری فقرہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مفتوحہ مال و جائداد تمام اُمت مسلمہ کا حق ہے نہ کہ کسی ایک فرد یا طبقہ کا اس لئے اس کو اسٹیٹ کی ملکیت قرار دینا لازم تھا ۔ چونکہ تمام بڑے بڑے صحابہ حضرت عمرؓ کی اس توجیہ سے متفق تھے ۔ اس لئے شام و عراق کے مفتوحہ علاقے حکومت کی ملک قرار پائے اور ان کی آمدنی فلاح عامہ کے لئے وقف کر دی گئی ۔ اس طرح اہلِ فوج کا یہ حق جاتا رہا کہ وُہ مالِ مفتوحہ کو آپس میں تقسیم کرلیں ۔ اس فیصلہ سے ایک طرف تو مال و جائداد کی تقسیم میں مساوات کا اصول قائم ہوگیا ۔ اور دُوسری وُہ خطرہ بھی مسدُود ہوگیا جس کا ظہور روما میں ہُوا تھا یعنی فوج یا حکومت کا کوئی طبقہ بڑے پیمانہ پر زمینداری اور جاگیرداری کے طریقہ کو رواج دے ۔ حضرت عمرؓ نے اس خطرہ کے خلاف مزید حفاظتی تدبیر یہ اختیار کی کہ مُسلمانوں کے لئے مفتوحہ علاقوں میں زمین کی خریداری کو ممنوع قرار دیا ۔ اس طرح اسلامی فوج بالکل سول طاقت کے ماتحت ہوگئی کیونکہ اس کے رزق کے تمام وسائل حکومت کے ہاتھ میں تھے اور وہ اپنے وظائف اور مشاہروں کے لئے حکومت کی دست نگر تھی ۔ اگر حضرت عمر فوج کے مطالبہ کو تسلیم کر لیتے تو اس کا ایک نتیجہ علاوہ دیگر نتائج کے یہ ہوتا کہ سول طاقت کو فوج کا دست نگر رہنا پڑتا اور اس طرح فوجی آمریت کا قیام آسان ہو جاتا ۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف کوفہ اور مصر میں جو تحریک بغاوت شروع ہوئی اس کا اصلی سبب فوج کی بے اطمینانی تھی یہ یاد رہے کہ کوفہ اسلامی فوج کا سب سے بڑا مستقر تھا ۔ اور مُسلمانوں کی فوجی قوت یہیں مرتکز تھی ۔ مدینہ میں اس وقت کوئی فوج نہیں رہتی تھی ۔ چنانچہ باغیوں نے جب مدینہ میں فتنہ و فساد شروع کیا تو وہاں شہر اور خلیفہ کی مدافعت کے لئے کوئی فوجی رسالہ نہ تھا ۔ اہل کوفہ کی بے اطمینانی کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اَب محسُوس ہونے لگا کہ اگرچہ اسلام کی فتوحات کا سہرا مجاہدین اور فوجوں کے سر تھا لیکن اس کا فائدہ انھیں نہیں بلکہ مرکزی حکومت کو پہنچا ۔ کیونکہ فے کا حق ...... حکومت کو مل گیا اور اس طرح وُہ حکومت کے ماتحت اور دست نگر بن گئے ۔ حالانکہ حکومت کی مضبوطی اور استواری انھیں کی جانفروشیوں کی مرہونِ منت تھی ۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک فتوحات کا سلسلہ جاری تھا ۔ اور اہلِ فوج کی تمام تر توجہ جنگی کارروائیوں پر مرتکز تھی ۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کے جاہ و جلال اور عظمت و دبدبہ کے آگے بڑوں بڑوں کو دم مارنے

کی مجال نہ تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ کی کارروائی کا فوری طور پر کوئی ردِّ عمل نہیں ہوا، اور اہلِ فوج نے خاموشی سے ان کے فیصلہ کو مان لیا لیکن حضرت عثمانؓ کی شخصیت اتنی بارعب نہ تھی۔ اس کے علاوہ اب مسلمانوں پر حالتِ جنگ بھی نہیں طاری تھی یہ زمانہ مقابلتہً پُرامن تھا۔ اسلئے اہلِ فوج کو حکومت کے خلاف اپنی بے اطمینانی ظاہر کرنے کا موقعہ ملا۔ ہم شروع ہی میں بتا چکے ہیں کہ عربوں میں حکومت کی اطاعت پذیری کا جذبہ کبھی بھی نہ تھا بلکہ وہ کسی مرکزی اقتدار کے سامنے جھکنے اور محصول ادا کرنے کو اپنے قومی شرف و وقار کے خلاف سمجھتے تھے۔ اسلام نے حکومت کی وفاداری کو خدا اور رسولؐ کی وفاداری کے ہم معنی قرار دیکر ان کے جذبہ اطاعت کو اُبھارا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد رسول اطاعت کا سوال خارج از بحث ہو گیا۔ صرف خلیفہ رسول کی اطاعت کا سوال تھا لیکن خلفاء کی حیثیت اور رسول کی حیثیت میں بڑا فرق تھا۔ رسول تو براہ راست احکامِ الٰہی کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ اس لئے آپ کے فیصلوں میں کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن خلفائے اسلام کے احکام جبکہ وہ ملکی اور فوجی امور سے متعلق ہوتے انکی اپنی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہوتے۔ اس لئے ان کے متعلق اہلِ فوج کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ پھر چونکہ اسٹیٹ کی وفاداری کی عربوں میں کوئی روایت نہ تھی۔ اس لئے خلیفہ وقت کی اطاعت کا جذبہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا گیا، تا آنکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اس کے خطرناک نتائج ظاہر ہونے لگے۔ عام اہلِ عرب کی مرکز گریزی اور جذبہ اطاعت کے فقدان کا مظاہرہ نہ صرف حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں ہوا بلکہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج نے بھی اسی خودسری کا ثبوت دیا اور اپنے لیڈر حضرت علیؓ کے احکام سے انحراف کیا۔ یہ یاد رہے کہ خوارج کا فرقہ زیادہ تر بدوی اعراب پر مشتمل تھا جو بالکل ہی غیر متمدن حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے اور جنکے متعلق خود قرآن کا یہ فیصلہ تھا کہ :-

الاعرابُ اشدُّ کفرًا و نفاقًا — بدوی عرب کفر و نفاق میں سب سے آگے ہیں -

غرضیکہ اسلامی افواج کی خودسری اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں سے بے اطمینانی عثمانی دَور کے فتنہ و فساد اور حضرت علی کے زمانہ کی خانہ جنگیوں کا ایک بڑا سبب تھی۔ اسلام کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ عربوں کے قبائلی روایات اور انکی طبعی خودسری اور آزادہ روی کو اتنے مختصر عرصہ میں بالکل مٹا دیتا۔ یہ کام صرف ایک فوجی آمریت ہی کر سکتی تھی، لیکن اسلام ایک جمہوری تحریک تھی جو تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ عوام کی بتدریج اصلاح کرنا چاہتی تھی۔ اور آمرانہ طریقوں یا فوجی تشدد کے استعمال کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اگر ایسے طریقوں کے استعمال سے نظام خلافت کو بچا بھی لیا جاتا تو نتیجہ وہی ہوتا بلکہ اس سے بدتر جو ملوکیت کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔

خلافت راشدہ کی ناکامی میں عربوں کے قومی مزاج و روایات کا جو دخل تھا اس کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علی کو امیر معاویہ کے مقابلہ میں ناکامی اسی سبب سے ہوئی کہ وہ ایک انفرادیت پسند اور خودسر پارٹی کے قائد تھے جس کے اندر فوجی اور سیاسی اطاعت کا کوئی جذبہ نہ تھا اس کے برعکس حضرت معاویہ شام کے والی تھے۔ جہاں کے عام باشندے رومی دَور سے متمدن زندگی اور سیاسی نظم و ضبط کے عادی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی فتوحات کے وقت عربی قبائل کی ایک

کثیر تعداد شام میں جا بسی تھی۔ لیکن اول تو انھیں شام میں اپنے ہم قوم عربوں سے سابقہ تھا۔ جو پہلے ہی سے سیاسی اطاعت پذیری کے عادی تھے۔ دوئم ان کا تعلق حضرت معاویہ سے وہ نہ تھا جو اہل کوفہ اور خوارج کا حضرت علیؓ کے ساتھ تھا۔ حضرت علی ایک جمہوری لیڈر تھے جنھیں کوفہ اور مصر کے اہلِ فوج کی تائید و حمایت سے منصب خلافت حاصل ہوا تھا۔ اس لئے وہ جمہور کی رائے اور مرضی کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے برخلاف حضرت معاویہؓ کو شام میں جو پوزیشن حاصل تھی اس میں اہلِ شام یا عربی قبائل کی کوششوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے لیڈر کی غیر مشروط حمایت پر آمادہ تھے۔ اسی وجہ سے حضرت علی کو جن داخلی مصائب اور لڑائیوں کا سامنا کرنا پڑا امیر معاویہ ان سے بالکل محفوظ رہے۔ حضرت علی کو ایک طرف تو حضرت زبیر، طلحہ اور حضرت عائشہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کے خلاف جنگ جمل لڑنی پڑی اور دوسری طرف اپنی فوج کے اس حصہ کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جو بعد میں خوارج کے نام سے موسوم ہوا۔ مختصر یہ کہ حضرت علی کے مقابلہ میں حضرت معاویہ داخلی طور سے زیادہ محفوظ و مامون تھے اور اسی وجہ سے حضرت علی کو انھیں شام سے بے دخل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ اور اسی ناکامی نے بالآخر اسلام میں ملوکیت کی بنیاد رکھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ جس میں اسلام ظہور پذیر ہوا جمہوری روایات اور طریقِ کار کے لئے ناسازگار تھا۔ علاوہ ازیں عربوں کی جمہوریت پسندی میں مرکز گریز میلانات کی شدت بھی اسلامی جمہوریت کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ غرضیکہ خلافت کے جمہوری نظام کی ناکامی اسلام کی ناکامی نہ تھی، بلکہ حالات اور زمانہ کا ایک قدرتی اقتضا تھا۔

خلافت راشدہ کے زوال کا ایک اور بڑا سبب جاگیری نظام کا ظہور تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روما میں فتوحات کی وسعت کے ساتھ دولتمند امراء کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس نے غریب کسانوں سے ان کی زمینیں خرید کر بڑی جائدادیں بنالیں جن پر غلاموں کی ایک کثیر تعداد سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے کسانوں کی حالت روز بروز کمزور ہوتی گئی اور بڑے جاگیرداروں کی ملکیت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ کسی قدر فرق کے ساتھ اسلامی حکومت میں بھی یہی واقعات ظہور پذیر ہوئے اگرچہ یہاں جاگیرداری کی نوعیت مختلف تھی اور اس کا دائرہ مقابلتہً محدود تھا۔ یہاں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے باعث غلاموں پر وہ مظالم نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ان سے مویشیوں کی طرح زراعت اور کھیتی باڑی کا کام لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے دور میں ہمیں کسی ایسی جاگیر کا پتہ نہیں چلتا جس پر غلاموں کو کثیر تعداد میں کام کرنا پڑا ہو۔ یہ چیز خلافت کے بعد معرض ظہور میں آئی لیکن اس پیمانہ پر نہیں جس پر روما میں اس کا ظہور ہوا۔ لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے قطع نظر حضرت عمرؓ کی دوربینی اور جذبہ مساوات کو بھی اس معاملہ میں بہت دخل تھا کیونکہ آپ ہی کی وجہ سے مفتوحہ آراضی کو حکومت کی ملک قرار دے کر مفتوحہ علاقوں کے کسانوں کے حقوق کی حفاظت کر دی گئی اور مسلمانوں کو زمینات خرید کر کے جاگیریں پیدا کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ بھی درحقیقت اسلام کی بالواسطہ برکت تھی کیونکہ حضرت عمرؓ نے نظامِ جاگیرداری کے قیام کے خلاف جو حفاظتی تدابیر اختیار فرمائیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے فیضِ تربیت اور اسلامی جذبہ مساوات کا نتیجہ تھا۔ لیکن حضرت عمر کے بعد سے مسلمان خلفاء نے انکی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ اس میں کچھ ان کی ذاتی کمزوریاں تھیں اور کچھ صورتِ حال کا اقتضاء۔ ہم انکی ذاتی خصوصیات سے بحث کرنا نہیں چاہتے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کس طرح جاگیریت کا نشو ونما وقت کا ایک قدرتی اقتضا تھا۔ جس کے لئے اسلام کو موردِ الزام یا اس کے مشن کو ناکام نہیں قرار دیا جاسکتا ہے

جاگیری نظام کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انیسویں صدی میں صنعتی ارتقاء مصنوعات کی کثرت اور وسیع پیمانہ پر صنعتی کارخانوں کے قیام سے پہلے یہ دُنیا کے ہر حصّہ کا قدرتی نظام تھا۔ اس کے ساتھ ہر مُلک کی فوجی اور دفاعی ضروریات وابستہ تھیں۔ چنانچہ یورپ سے لیکر ہندوستان تک جزئی اختلافات کے ساتھ ہر سلطنت جاگیرداروں سے مُلک کی حفاظت اور دفاع کا کام لیتی تھی۔ اس طرح یہ نظام صرف معیشت سے متعلق نہ تھا بلکہ دفاعی ضروریات کا بھی کفیل تھا۔ اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ اس نظام کی ضرورت صنعتی انقلاب سے پہلے کیوں پیش آتی رہی تو معلوم ہوگا کہ اس کے دو سبب تھے۔ اوّلاً اس زمانہ تک دولت کی تمام شکلوں میں زمین کو سب سے زیادہ اہمیّت حاصل تھی۔ قیمتی دھاتوں کی کمی کے باعث اس عہد میں سکّہ کا رواج بہت کم تھا اور اشیاء کا مبادلہ عموماً خدمات کے مبادلہ کی صورت میں ہوتا تھا۔ چنانچہ یورپ میں جہاں سکّہ کا رواج اسلامی ممالک کی بہ نسبت بہت کم پایا جاتا تھا جاگیرداری نظام اپنی انتہائی وسعت و شدّت کے ساتھ قائم تھا۔ اس کے بالمقابل اسلامی ممالک میں یہ نظام اتنا ہمہ گیر اور ظالمانہ نہ تھا کیونکہ یہاں سکّہ کا رواج بہ نسبت یورپ کے زیادہ تھا۔ غرضکہ جہاں جہاں اور جس جس نسبت سے دولت کی دیگر شکلیں ناپید تھیں وہاں اسی نسبت سے زمین کو دولت و ثروت کا سب سے زیادہ بہتر ذریعہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ اس زمانہ میں حمل و نقل کے وسائل اور خبر رسانی کے ذرائع محدود تھے، اس لئے کوئی بڑی سلطنت جاگیرداروں کی مدد اور وساطت کے بغیر ملک کا دفاعی اور صوبائی انتظام نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ دُور دراز مقامات پر مرکزی حکومت کے لئے فوج اور پولیس اور مالگزاری کی وصولی کے محکمہ جات قائم رکھنا ناممکن تھا۔ اس لئے مرکز کے لئے صوبہ جاتی اور علاقائی (REGIONAL) انتظام کا مناسب ترین طریقہ یہی تھا کہ وہ ملک کو مختلف جاگیرداروں میں بانٹ دے اور ہر جاگیردار پر کچھ فوجی خدمات لازم کردے۔ چنانچہ یہ جاگیردار نہ صرف مرکز کے لئے فوج مہیّا کرتے اور اس کی تربیّت کرتے بلکہ محصولات کی وصولی کے سلسلہ میں بھی ان کی خدمات سے کام لیا جاتا اور مقامی حکومت کے بہت سے فرائض بھی ان کے سپرد ہوتے۔ جب تک یہ طبقہ مرکز کا وفادار رہتا انتظام سلطنت میں کوئی نقص نہیں آتا لیکن اگر یہ لوگ خود سر ہو جاتے تو ملک میں لامرکزیت اور خانہ جنگی پیدا ہو جاتی اور بسا اوقات بڑی بڑی سلطنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ یہاں پر پھر اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وسط ایشیا کی مسلمان سلطنتوں میں عموماً مرکز کی گرفت جاگیرداروں پر زیادہ مضبوط تھی اس کے برعکس یورپ کے بادشاہ بالعموم جاگیرداروں کے مقابلہ میں کمزور تھے اور ان کا مرکزی اقتدار زیادہ مستحکم نہ تھا کیونکہ وہاں جاگیرداروں کی خود مختاری اور داخلی آزادی نسبتاً زیادہ

مستحکم تھی۔ جس وقت عرب فاتح کی حیثیت سے وسط ایشیا کے ملکوں میں داخل ہوئے تو وہ نرے سپاہی تھے اور جاگیری نظام سے ناآشنا تھے کیونکہ عرب میں زراعت بہت محدود پیمانہ پر ہوتی تھی۔ زرعی آراضی بہت قلیل اور مختصر تھیں اور بدوی عرب زیادہ تر مویشیوں پر زندگی گزارتے تھے، یا لوٹ مار کر کے گزر اوقات کرتے تھے، قریش تاجر تھے۔ عرب میں خالص زرعی آبادی برائے نام تھی، اس لئے وہاں زمیندار تو تھے اگرچہ بہت کم تعداد میں مثلاً طائف کے علاقہ میں لیکن جاگیرداروں کا نام و نشان نہ تھا۔ رومی سپاہی جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کاشتکاروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن عرب مجاہدین کا جنگ کے علاوہ اور کوئی پیشہ نہ تھا بجز اس کے کہ چند گنے چنے افراد تجارت یا مویشی پالنے کے پیشہ میں مصروف تھے جب تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا مال غنیمت وافر مقدار میں ملتا رہا اور حکومت اہل فوج اور ان کے اہل و عیال کو وظائف دیتی رہی عربوں نے اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا کہ جنگوں کے اختتام پر ان کا ذریعۂ معاش کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے جب حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ مفتوحہ علاقوں کے غیر مسلم کاشتکاروں اور زمینداروں کو انکی زمینات پر بحال رکھا جائے اور مجاہدین کے خدمات کی معاوضہ کے لئے تمام مفتوحہ آراضی کو حکومت اسلامی کی ملکیت قرار دیا جائے اور ان زمینوں کے خراج سے جو آمدنی ہو اس کو وظائف کی شکل میں مجاہدین اور ان کے اہل و عیال بلکہ غلاموں تک کو تقسیم کیا جائے، تو اہل فوج نے اس فیصلہ کی کوئی خاص مزاحمت یا مخالفت نہ کی۔ لیکن حضرت عمر کا قائم کردہ نظام اپنی نوعیت کے اعتبار سے عارضی تھا کیونکہ اوّل تو جنگوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہنے والا نہ تھا۔ دوئم یہ ناممکن تھا کہ عرب کی پوری آبادی اور غیر عربوں کو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہتے تھے خالصتہً فوجی زندگی کے لئے وقف رکھا جائے اور حکومت ان کے گزارے کے لئے وظائف کی تقسیم کا انتظام کرتی رہے۔ چنانچہ اس قسم کی مالی دشواریاں خود حضرت عمر کو پیش آنے لگیں جن سے یہ محسوس کیا جانے لگا کہ فوجی کمیونزم کا یہ نظام بلا اصلاح و تبدیلی جاری نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جلولاء کی جنگ کے بعد کئی ہزار ایرانی دھاقین (زمیندار) مسلمان ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کے پیش نظر اب یہ سوال تھا کہ آیا قاعدہ کے موافق ان سب کو خراج (محصول زمین) اور جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے غالباً یہ محسوس کیا ہوگا، کہ اگر شام و ایران کی زرعی آبادی اسی طرح مسلمان ہوتی جائے، تو ان سب کو خراج اور جزیہ سے مستثنیٰ کرنا ناممکن ہوگا کیونکہ اس سے حکومت کی آمدنی بہت گھٹ جائے گی اور غیر مسلم کاشتکار زراعت کا پیشہ چھوڑ کر حکومت کے وظائف پر زندگی گزارنے کا مطالبہ کرینگے۔ ظاہر ہے کہ حکومت اسلامی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ سارے کے سارے نومسلموں کو فوج میں بھرتی کر کے انکے لئے بیت المال سے وظائف مقرر کر دے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ان نومسلم دھاقین کا جزیہ تو معاف ہو جائیگا مگر ان کی زمین پر بدستور خراج عائد کیا جائیگا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے زمانہ میں عین التمر کا ایک دہقان مسلمان ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے بھی خلیفہ دوم کی طرح اس کا جزیہ معاف کر دیا لیکن خراج (محصول زمین) برقرار رکھا۔ حجاج کے زمانہ میں یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا اور عراق کے کسانوں کی ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول

کرکے زرعی کاروبار ترک کردیا۔ یہ لوگ شہروں میں اس توقع پر منتقل ہونے لگے کہ وہاں حکومت ان کو وظائف دیگی۔ حجاج نے ان سب کسانوں کو شہروں سے نکلوا کر انکی زمینوں پر واپس کردیا اور خراج کے علاوہ ان سے بکبر جزیہ بھی وصول کرتا رہا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں اس ظالمانہ طریقہ کو مسدود کردیا اور نومسلم کاشتکاروں سے جزیہ کے بجائے صرف خراج وصول کیا۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مالیات کو جو نظام قائم کیا تھا وہ زمانہ جنگ کی ضروریات کے لئے تو مناسب تھا لیکن حالات امن میں اس کا قائم رہنا دشوار تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی چند سالوں تک سلسلۂ جنگ جاری رہا اور سلطنت کی توسیع ہوتی گئی۔ لیکن اس کے بعد اسلامی حکومت کی وسعت پذیری کا سلسلہ رک گیا۔ اور عربوں کی توجہ قدرتاً دوسرے مشاغل حیات کی طرف مبذول ہوگئی۔ ایسے زمانہ میں عرب فاتحین کی ساری آبادی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ صرف تجارت کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیں یا سب کے سب فوج سے وابستہ رہیں۔ دولت کی فراوانی حکومت کی توسیع اور مال غنیمت کے اجتماع کی وجہ سے مسلمانوں میں دولتمندوں کا ایک خاصا طبقہ پیدا ہوگیا تھا۔ مثلاً حضرت طلحہ، زبیر اور سعد بن وقاص نے اپنے بعد بے شمار دولت چھوڑی۔ اسلام نے ادائے زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی شرط کے ساتھ دولت کے حصول پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی نیز اسلامی عہد تک حکومت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا کہ وہ انکم ٹیکس جیسے محصولات کی ضرورت محسوس کرتی۔ اس قسم کے محصولات کا سلسلہ انیسویں صدی میں اس وقت سے شروع ہوا جبکہ حکومت نے بہت سے معاشرتی خدمات اپنے ذمے لینے شروع کئے اور صنعتی ارتقاء کے باعث کارخانہ داروں کی آمدنیوں میں اتنا عظیم الشان اضافہ ہوگیا جس کا تصور بھی پہلے ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسلامی دور میں جو دولتمند طبقہ پیدا ہوا اس کی فطری خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے روپیہ پیسہ سے آراضی خریدے اور جاگیریں پیدا کرے۔ حضرت عمر کے بعد جو نئے حالات رونما ہوئے ان کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی خواہش کی تکمیل کا موقعہ ملا اور انھوں نے وسیع پیمانہ پر مفتوحہ علاقوں میں زمینات خرید لیں اس کے علاوہ خود خلفاء نے بھی بعض لوگوں کو مفتوحہ ممالک کی آراضی میں سے جاگیریں عطا کیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران و روم کے شاہی خانوادے کی وسیع آراضی۔ مفرور شدہ امراء کی جاگیریں اور آتشکدوں کی زمینات حکومت کے ہاتھ آئی تھیں جنھیں اس دور کی اصطلاح میں صوافی کہا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں حکومت کی ملک قرار دیا تھا اور ان میں سے شاید ہی کسی کو کوئی زمین بطور جاگیر دی ہو۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس روایت کو قائم نہ رکھا اور چند لوگوں کو صوافی میں سے جاگیریں عنایت کیں۔ سرحدات کی حفاظت کے لئے بھی جاگیریں عطا کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں امیر معاویہ نے رومی حکومت کے خلاف مضبوط دفاعات قائم کیں۔ بحری بندرگاہوں کو قلعہ بند کروایا اور اس انتظام کو مستقل طور پر قائم رکھنے کے لئے حضرت عثمانؓ سے درخواست کی کہ شام میں صوافی کی جو آراضی حکومت کے قبضہ میں ہیں ان میں سے مدافعین کو جاگیریں دی جائیں۔ حضرت عثمان نے دفاعی ضروریات کے تحت یہ تجویز منظور کرلی۔ پھر حضرت معاویہ یزید اور دیگر اموی سلاطین کے تحت

مُسلمان بادشاہوں نے امرا کی سرپرستی کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر جاگیریں عطا کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ سعید بن العاص یہ دعویٰ کرنے لگے کہ پورے سواد (عراق) کا علاقہ قریش کی جاگیر ہے۔ مختصر یہ کہ عربوں کا بدوی اور قبیلوی زندگی سے جاگیری دَور کی طرف جانا تاریخی ارتقار کی ایک ناگزیر منزل تھی۔ اسلام ہو یا کوئی اور مذہبی فکری اور سماجی تحریک ہو وُہ ارتقاء تاریخ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لھذا اِسلام کو اِس معیار پر جانچنا کہ اس نے عرب قوم کو بدویت سے جاگیرداریت کی طرف کیوں جانے دیا ایک احمقانہ عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس نظام میں کوئی اعتدال پیدا کیا یا نہیں اور اپنی روح مساوات سے اس کی ناانصافیوں میں تخفیف کر سکا یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اسلام کے ایک کامیاب تحریک ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اصل بات جس پر معترضین کو غور کرنا چاہیئے وُہ یہ ہے کہ اسلام کی ہمعصر دُنیا کے ان خطوں کی معاشرتی عدل کے لحاظ سے کیا حالت تھی جہاں اسلام کا قدم نہیں پہنچا تھا۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے ہم اِس مسئلہ پر تفصیلی بحث نہیں کرینگے، اور صرف اس دعویٰ پر اکتفا کرینگے کہ اگر اسلام کی ہمعصر یورپین سلطنتوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے یا بازنطینی حکومت میں عوام الناس کے حال زار پر نظر کی جائے تو کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام نے زندگی کا جو ڈھانچہ وضع کیا اِس میں ہمعصر دُنیا کے طبقاتی مظالم، نسلی امتیازات اور سرمایہ دارانہ استحصال کی بہ نسبت بہت زیادہ عدل و مساوات اور نسلی اشتراک و تعاون پایا جاتا تھا اور یہ سب اسلامی تعلیمات کی برکتوں کا نتیجہ تھا ورنہ اگر عربوں کو اسلامی تربیت کا فیض حاصل نہ ہوتا تو یہ بات یقینی تھی، کہ ان کی سلطنت ظلم اور انسانیت سوزی میں اپنی ہمعصر سلطنتوں سے بہت آگے نکل جاتی۔

آخر میں ہم یہ بھی بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ بنو امیّہ کی ملوکیت کے قیام اور جاگیری نظام کے نشو و نما کے بعد بھی اسلام نے بہت سے مستقل اثرات چھوڑے جن کو نہ ملوکیت کی مفاد پرستی مٹا سکی اور نہ جاگیریت کی طبقاتی تقسیم متاثر کر سکی۔ معاشرتی زندگی کے وُہ کون سے اصلاحات تھے، جن کو اسلام کی مخالفانہ قوتیں صدمہ نہیں پہنچا سکیں۔ اختتامِ مضمون سے پہلے ہم ان کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں۔

اولاً اِسلام نے انسانی فکر کو مشرکانہ اوہام پرستی سے نکال کر مشاہدہ حیات اور عقل و استدلال کے راستہ پر لگایا اور یہ وسعتِ فکر جو انسانوں میں اسلام کی برکت سے پیدا ہوئی تمام سیاسی اور معاشی انقلابات کی زد سے محفوظ رہی۔ یہ عقلی بیداری اسلامی علوم و فنون کے جملہ شعبوں میں جلوہ گر تھی، اسلامی فقہ میں امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف جیسے جلیل القدر ماہرینِ قانون، اسی علمی نہضت کے نمائندے تھے۔ علمِ کلام میں اشعری، باقلانی نظّام، ابو لھذیل علّاف اور جاحظ جیسے مفکرین پیدا ہوئے۔ معتزلہ کے تمام شیوخ اسلامی عقلیت کے علمبردار اور تقلید کی بندشوں کے مخالف تھے اِن کے فکری نظام کا نقطۂ آغاز ہی یہ تھا کہ شریعت کے اوامر و نواہی اشیا کے ذاتی حسن و

فہم پر مبنی ہیں اور خدائی احکام بندوں کے مصالح کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر یہی عقلی آزادی جو اسلام کی برکت سے وجود میں آئی تھی۔ طبعی علوم کی ترقی کا باعث ہوئی اور تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ مسلمانوں نے طبیعیات، فلکیات، کیمیا اور ریاضیات میں نئے نئے ابواب واکتشافات کا اضافہ کیا۔ اموی انقلاب یا عباسی ملوکیت اس آزادی فکر اور عقلی ترقی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکی اور علم و عقل کا کارواں بدستور اپنی راہ پر گامزن رہا۔ تو اس کی ان فکری اور علمی فتوحات سے قطع نظر اسلام نے عوامی تعلیم و تربیت کو اتنی ترقی دی، جس کا کوئی دوسری تہذیب مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ مخالفین اسلام بھی اس باب میں اسلامی کارناموں کے معترف ہیں۔ چنانچہ جوزف ہل لکھتا ہے[۱]:-

> "قرآن کی تعلیم کا شغف رفتہ رفتہ عوام تک پھیل گیا۔ یہ اسلام کی جمہوری روح کا لازمی اقتضا تھا، کیونکہ ہر مسلمان پر ابتدائی تعلیم مذہبًا فرض تھی۔ اس مقصد کے حصول کی غرض سے مسلمانوں نے اپنی تاریخ کی ابتدائی دور میں تعلیم عامہ کی طرف توجہ مبذول کی۔ اگرچہ اس تعلیم کا دائرہ صرف قرآن تک محدود تھا۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں اتنے بڑے پیمانہ پر تعلیم کا ایسا انتظام بھی ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف عرب میں بلکہ تمام مفتوحہ ممالک میں عوام کی تعلیم کے لئے کثرت سے مدارس قائم کیے جس کی نظیر نہ تو یونان و روم کی قدیم تہذیب میں ملتی ہے اور نہ عیسائیت کی تاریخ میں۔"

اسلام ایک ایسے عہد میں ظہور پذیر ہوا جبکہ مذہبی رواداری ناپید تھی اور لوگ عقائد کے معمولی اختلافات پر قتل و خونریزی کا بازار گرم کر دیتے تھے۔ بڑی بڑی سلطنتوں کی اساس فرقہ داریت پر رکھی جاتی اور جو مذہبی فرقے اہل حکومت کے مسلمہ عقائد کو نہیں مانتے انھیں نہ صرف حکومت کے دروبست میں کوئی جگہ نہیں ملتی بلکہ اکثر و بیشتر ان پر وسائل رزق کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے اور بعض اوقات انھیں خارج البلد کر دیا جاتا۔ بازنطینی حکومت میں نسطوریوں اور یعقوبی فرقہ کے ماننے والوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے۔ آریوسی فرقہ کو جس بے دردی کے ساتھ مشرقی رومی سلطنت میں مٹایا گیا وہ بھی مذہبی نارواداری کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ اسلام نے آتے ہی یہ تمام مذہبی فتنے مسدود کر دیئے اور اختلاف عقائد کی بناء پر کسی کو اس کے حقوق سے محروم نہیں کیا۔ اسلامی سلطنت میں عیسائیوں اور یہودیوں کو جو مذہبی آزادی حاصل تھی وہ انھیں اپنی ہم مذہب حکومتوں اور سلطنتوں میں بھی نصیب نہ تھی۔ غرضیکہ اسلام نے وسط ایشیا میں مذہبی رواداری کی روایت قائم کی۔ جس پر اہل یورپ اٹھارھویں صدی میں تحریک اصلاح مذہب کے بعد گامزن ہوئے۔ مذہبی عقائد کے معاملہ میں حکومت کی ناطرفداری کا وہ تصور جس پر یورپ کی سیکولر تحریک بنی ہے اسلامی تعلیمات ہی کا ایک شاخسانہ ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ بعد میں مسلمان اپنی اس مذہبی روایت سے منحرف ہو کر فرقہ داریت اور مذہبی تعصب کا شکار ہو گئے۔ پھر بھی یورپ کے قرون وسطی میں مذہبی نارواداری کا جو طوفان برپا تھا۔ اس کے دیکھتے ہوئے مسلمان اپنے دور تعصب میں بھی مذہبی رواداری کے لحاظ سے مقابلتًا بدرجہا بلند تھے

---

[۱]

اسلام کا ایک اور بڑا سماجی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے عورتوں اور غلاموں کو معین حقوق عطا کر کے انھیں سماجی ظلم و ستم سے بچا لیا۔ عورتوں کو اسلام نے جو قانونی اور معاشرتی حقوق عطا کیے وہ انھیں یورپی ممالک میں انیسویں صدی میں حاصل ہوئے۔ افسوس ہے کہ اس دائرہ میں بھی مسلمانوں نے اسلامی معیارات کو پوری طرح مدّنظر نہیں رکھا اور اپنے دورِ زوال میں عورتوں کو بہت سے قانونی اور سماجی حقوق سے عملاً محروم کر دیا لیکن کوئی منصف مزاج مؤرخ اس امر کا انکار نہیں کر سکتا کہ صدیوں تک اسلامی سوسائٹی میں عورت کا مرتبہ دوسرے معاشروں کی بہ نسبت بہت بلند رہا اور صرف انیسویں اور بیسوی صدی میں مغربی تہذیب اس دائرہ میں مسلمانوں کے معیارات سے آگے بڑھ گئی۔ یہی بات غلامی کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب اس مثال سے خالی ہے کہ غلاموں نے اس کی سوسائٹی میں فرمانروائی اور قیادت کا مقام حاصل کیا ہو۔ لیکن اسلامی تاریخ میں مصر کے مملوک اور ہندوستان کا خاندانِ غلاماں دو ایسی ٹھوس مثالیں ہیں جن کو کوئی مخالف بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے اخلاقی معیار کو اسلام نے جتنا بلند کیا اس کی نظیر کسی اور شعبہ میں نہیں ملتی۔ خلافت راشدہ کے بعد جتنے انقلابات واقع ہوئے ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کو اس معاشرتی فضیلت سے محروم نہ کر سکا۔

اسلام کے مستقل اور دیرپا کارناموں میں قومیت اور نسلیت کے امتیازات کی بیخ کنی بھی شامل ہے۔ بنو امیہ نے عربی قومیت کو ابھارنے کی بہت کوشش کی لیکن اسلام نے مساواتِ انسانی کے جو معیارات قائم کر دیے تھے وہ اتنے مستحکم ثابت ہوئے کہ خود بنو امیہ کا تختِ حکومت ان کے مقابلہ پر الٹ گیا۔ لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں، کہ اموی حکمران عرب تھے، انکے گورنر، والی اور عمال عرب تھے لیکن انھیں نہیں معلوم کہ اموی دور میں مسلمانوں کی ساری علمی اور ثقافتی زندگی پر غیر عرب مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ اسلام کے سب سے بڑے جیّد فقیہہ حضرت امام ابو حنیفہ غیر عرب تھے۔ معتزلہ کے تمام بڑے بڑے لیڈر عجمی نومسلم تھے۔ اسی طرح بہت سے محدثین بھی غیر عرب قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔ اموی نظم و نسق میں بھی موالی (عجمی نومسلم اشخاص) کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔

"۱۰۰ھ میں افریقہ کا گورنر ایک مولیٰ تھا جس کا نام یزید بن ابی مسلم تھا عبید اللہ بن حبحاب مصر کا عامل خراج مولیٰ تھا۔ اسی طرح کرمان کا گورنر جیابہ خراسان کا کمانڈر ابن السیاوش۔ شاش کا گورنر نزاک بن صالح حجاج کا وزیر خزانہ صالح بن عبد الرحمن یہ سب لوگ موالی تھے نظم و نسق کے محکموں کے اکثر ناظم اور ڈائرکٹر تقریباً تمام سیکرٹری، مشیر، اہلکار، جاگیروں کے منیجر حکومت کے تجارتی ایجنٹ اور بڑے بڑے متمول عربوں کے کارندے بھی موالی تھے۔"[1]

یہ بھی یاد رہے کہ بنو امیہ کے خلاف جتنی سیاسی اور مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان کی بنیاد ہی اس نکتہ پر تھی کہ اموی حکمرانوں نے اسلام کے اصول مساوات کو ترک کر کے غیر عرب مسلمانوں کے حقوق کو صدمہ پہنچایا ہے۔ چنانچہ خوارج کا سیاسی نعرہ بھی یہی تھا۔ مختار کی بغاوت کو بھی اسی مطالبہ سے تقویت ملی اور ایسی تمام تحریکوں میں عرب اور موالی ہمیں دوش بدوش

---

1. DANIEL DENNEL:

کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بنو امیہ کی شکست کا سب سے بڑا سبب ہی یہ تھا کہ وہ نومسلم عجمیوں کی تائید سے محروم تھے۔ اس لحاظ سے بنو عباس کی فتح کو ہم اسلامی مساوات کی فتح سے موسوم کر سکتے ہیں کیونکہ عباسی سلطنت میں عربوں کا قومی تفوق بالکل ختم ہو گیا اور ہر قوم کو یکساں ترقی کے مواقع عطا کیئے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے مساوات کا جو بیج بویا تھا، وہ موسم اور زمین کی ناسازگاری اور مخالف ہواؤں اور طوفانوں کے باوجود بارآور ہو کر رہا۔ درحقیقت اسلامی تحریک اور خلافت راشدہ کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا غلط ہے کہ گویا وہ زندگی کا کوئی مکمل اور مختتم ڈھانچہ تھا۔ جو ایک وقت میں قائم ہوا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناپید ہو گیا۔ اسلام ایک نصب العین حیات تھا۔ جو ایک مخصوص معاشرتی مزاج اور چند متعین اخلاقی۔ معاشرتی اور تہذیبی میلانات کا حامل تھا۔ انسانی تاریخ کے ایک ارتقائی دور اور عربوں کی قبیلوی زندگی میں ان میلانات و اقدار کے مطابق اجتماعی زندگی کی جو تشکیل عمل میں آئی اور جس کو تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے اس نے انسانیت کے مزید ارتقاء کا راستہ ہموار کیا اور اس کے لئے چند نشاناتِ راہ چھوڑ دیئے تاکہ آنے والی نسلیں اسی منزل کی طرف آگے بڑھیں۔ یہ نظام خلافت اپنے عہد کے ارتقائی ماحول عربوں کے رسم و رواج اور قبائلی زندگی کی محدودیتوں سے بالکل پاک نہ تھا۔ ان سماجی مجبوریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو اسے درپیش تھیں۔ اس کی کامیابیاں یقیناً محیر العقول اور اس کی ناکامیاں تقریباً ناگزیر تھیں۔ اگر اس کو وہ فنی اور علمی ترقیاں۔ نقل و حمل اور نشر و اشاعت کی وہ آسانیاں۔ نظم و نسق کی وہ سہولتیں اور تنظیم حیات کے وہ وسائل میسر ہوتے جو آج انسانی جماعتوں کو حاصل ہیں تو اس کا ڈھانچہ یقیناً بہت کچھ مختلف ہوتا۔ پھر بھی اس نے اُمت مسلمہ کے لئے ایک شاندار نمونہ قائم کر دیا۔ لیکن اسے نمونہ قرار دینے کے لئے ہمیں اس کے وقتی۔ زمانی اور مکانی عناصر کو خارج کرنا پڑیگا ورنہ ہم ان محدودیتوں میں الجھ جائینگے جن سے یہ نظام ناگزیر طور پر محصور تھا۔ ہمیں آج ایک بالکل نئے ماحول میں زندگی کی تشکیل کرنی ہے عصر حاضر کے کچھ اپنے تقاضے اپنی مجبوریاں اور محدودیتیں بھی ہیں، جن پر مکمل طور سے غالب آجانا ہمارے لئے بالکل اسی طرح ناممکن ہے جس طرح خلفائے راشدین کے لئے اپنے ماحول اور زمانہ کی مجبوریوں پر غالب آنا ناممکن تھا لیکن ہمارا نصب العین وہی ہونا چاہیئے اور ہماری کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ اس پر ہوگا کہ ہم موجودہ زمانہ کی ترقیات۔ وسائل اور سہولتوں کے مدنظر جمہوری اور معاشی مساوات کے قیام میں خلافت راشدہ سے کتنا آگے جا سکتے ہیں جبکہ اس نے ایک پسماندہ ملک۔ ایک غیر ترقی یافتہ عصر اور وسائل حیات کی کمیابی کے عہد میں مساوات انسانی کا اتنا بلند نمونہ قائم کر دیا۔